محمد منیر شیخ

پروفیسر میاں محمد شریف مرحوم

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے "کل نفس ذائقۃ الموت" (ہر ذی روح کو موت کا مزا چکھنا ہے)۔

انسان دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے لیکن بعض یادیں ایسی چھوڑ جاتا ہے جن کی وجہ سے اسے بعد از مرگ بھی یاد کیا جاتا ہے۔ پھر ان میں بعض یادیں ایسی ہوتی ہیں کہ جونہی ان کا ذکر کسی کی زبان پر آ گیا تو ساری محفل کی فضا سوگوار ہو گئی اور مرنے والے کی جدائی ہر فرد محفل کو محسوس ہونے لگی۔

ہمارے میاں صاحب بھی اپنے پیچھے کچھ ایسی ہی یادیں چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے میاں صاحب کے مختصر سوانح حیات تحریر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

میاں محمد شریف صاحب ۳۰ مارچ ۱۸۹۳ کو باغبانپورہ میں پیدا ہوئے۔ یہ آبادی لاہور میں مغلیہ دور کے خوبصورت شالامار باغ کے قریب واقع ہے۔ میاں صاحب کا خاندان میاں فیملی کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے کئی ایک فرزندوں نے ملکی سیاست اور ثقافت میں بہت نام پیدا کیا۔ ان میں سے ایک میاں سر محمد شفیع وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور دوسرے جناب جسٹس شاہ دین سابق پنجاب کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔

میاں صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم باغبانپورہ میں شروع کی اور پھر اسلامیہ اور ماڈل ہائی سکول میں زیر تعلیم رہنے کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج علیگڑھ میں داخل ہو گئے۔

بی۔ اے کی ڈگری انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی جو اس وقت ملک کی درجہ اول دانش گاہ سمجھی جاتی تھی۔ پھر کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔ اے تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۷ میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ ہی میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جب ۱۹۲۰ میں اس کالج کو یونیورسٹی بنا دیا گیا تو میاں صاحب شعبہ فلسفہ کے پروفیسر، اور چیئرمین مقرر ہوئے۔

آپ سر سید ہال کے چودہ سال تک انچارج رہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۱ سے ۱۹۲۴ تک یونیورسٹی کے تمام ہاسٹلوں کے انچارج بھی رہے۔

میاں صاحب میں بہت سی انتظامی صلاحیتیں تھیں جنھیں اندرون ملک اور بیرون ملک ہر جگہ سراہا گیا۔ ۱۹۴۶ میں میاں صاحب اس جماعت کے صدر منتخب ہوئے جس نے کل ہند مسلم لیگ کی انتخابی مہم کے سلسلے میں پروپیگنڈا کرنے کے لیے طلبا کے وجود ملک کے گوشے گوشے میں بھیجے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد میاں صاحب اپنے آبائی شہر لاہور تشریف لے آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ یہاں پر کئی اہم اور کلیدی اسامیوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۵۹ میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ادارے میں آنے کے بعد میاں صاحب نے دن رات کام کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت کا سکہ جما لیا۔

انھوں نے ۱۹۶۱ میں دفتر کی موجودہ عمارت کی توسیع کا منصوبہ بنایا اور اس کی دوسری منزل تعمیر کرائی۔ میاں صاحب کو فن تعمیر سے پوری پوری واقفیت تھی۔ انھوں نے ادارے کی دوسری منزل کو اس ڈھب سے بنوایا کہ کوئی شخص بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ پہلے یہ عمارت ایک منزلہ ہی تھی۔ دوسری عمارت کو اس خوبی سے اوپر کھڑا کیا گیا ہے کہ بناوٹ کے اعتبار سے پہلی اور دوسری منزل میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا۔

میاں صاحب جب دفتر تشریف لاتے تو سب سے پہلے ہمارے دفتر میں آتے۔ اس کے

اس کے بعد ٹھیکیدار کو ساتھ لے کر تعمیر شدہ عمارت کا معائنہ کرتے اور جہاں ذرا بھی تعمیری غلطی نظر آتی اس حصے کو فوراً ہی گرا دیتے۔ ایک روز صبح ہی صبح تشریف لے آئے اور ٹھیکیدار کے ساتھ انٹر فلور میں چلے گئے۔ وہاں جا کر ایک دیوار کی تعمیر کی طرف ٹھیکیدار کو توجہ دلائی۔ گفتگو کے دوران بحث چل نکلی۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ یہ دیوار ٹیڑھی ہے۔ لیکن ٹھیکیدار کا دعویٰ تھا کہ دیوار بالکل سیدھی ہے۔

میاں صاحب جناب اے۔ ایس فاروقی صاحب کو (جو پبلک سروس کمیشن حکومت مغربی پاکستان کے ممبر اور سابقہ انجینئر ہیں) لے آئے۔ انھوں نے دیوار کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اپنا فیصلہ میاں صاحب کے حق میں دیا۔ پھر کیا تھا ٹھیکیدار کو اپنی غلطی تسلیم کرنی پڑی اور دیوار کو گرا کر دوبارہ بنایا گیا۔ اس طرح کرنے سے اگرچہ ٹھیکیدار کو کافی مالی نقصان اٹھانا پڑا، لیکن میاں صاحب کی مہارت فن کی وجہ سے ادارے کی دیوار ٹیڑھی بننے سے بچ گئی۔

ہمارے دفتر کی عمارت میں ایک اور ادارہ تہذیب الاخلاق نامی قائم ہے۔ اس کے سربراہ سید محبوب عالم ہیں۔ یہ میاں صاحب کے بچپن کے دوست ہیں اس لیے ان کے اور میاں صاحب کے درمیان بہت زیادہ بے تکلفی تھی۔ یہ ادارہ لاہور سے ۲۴ میل دور ملتان روڈ پر مانگا میں ایک سکول تعمیر کرا رہا ہے۔ میاں صاحب کو عالم صاحب تعمیراتی مشورہ کی غرض سے وہاں لے گئے۔ میاں صاحب نے وہاں پر بھی اپنی فنی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تعمیر رکوا دی کیونکہ وہ ٹھیک تعمیر نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں بھی ٹھیکیدار نے تعمیر شدہ دیوار گرانے سے پہلے تو انکار کیا لیکن جب میاں صاحب نے دلائل سے ٹھیکیدار کی غلطی ثابت کر دی تو اس نے میاں صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور دیوار مسمار کرا دی۔

دفتری اوقات کے دوران میں اور نجی طور پر مجھے میاں صاحب سے کافی قریب

رہنے کا اتفاق رہا ہے۔ میاں صاحب جب دفتر تشریف لاتے تو باہر کے دروازے ہی سے ڈرائیور کار کا پہلا ہارن دیتا اور پھر دفتر میں داخل ہوتے ہی دوسرا ہارن ہوتا۔ ان دونوں ہارنوں کی آواز سنتے ہی میں اپنے دفتری کاغذات لکھنے کرنے شروع کر دیتا، اور جونہی میاں صاحب دفتر میں تشریف لاتے میں بھی ڈاک لے کر حاضر ہو جاتا اور میاں صاحب فوراً ہی کاغذات دیکھنا شروع کر دیتے۔

بعض اوقات عجیب اتفاق ہوتا کہ میاں صاحب کچھ کاغذات جو گھر سے اپنے ساتھ لاتے انھیں اپنی میز کی دراز میں یا کوٹ کی جیب میں رکھ لیتے اور جب میں ان کے سامنے آتا تو ان کاغذات کا مجھ سے تقاضا شروع کر دیتے۔ اس قسم کے کئی ایک واقعات پیش آئے۔ چند ایک کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یہ عادت تقریباً تمام فلاسفروں میں مشترک ہوتی ہے کہ اپنے خیالات و افکار کی محویت میں روزمرہ زندگی کے معمولی واقعات کو عام طور پر بھول جاتے ہیں۔ اور یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ ان کی یہ عادت ان کی عظمت اور بلندی افکار کی غماز بھی سمجھی جاتی ہے۔ میاں صاحب کی یہ عادت بھی اسی فلسفیانہ محویت کا نتیجہ تھی۔ بھول جانے کے ان دلچسپ واقعات کا ذکر کرنے کی غرض بھی میاں صاحب کی زندگی کے اسی اہم پہلو کو سامنے لانا ہے۔

میاں صاحب کا عام معمول یہ تھا کہ وہ روزانہ ساڑھے آٹھ بجے دفتر تشریف لے آتے تھے لیکن ایک روز آٹھ بجے ہی آ گئے۔ حسب معمول کار کے ہارن بجے اور میں ڈاک لے کر میاں صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ میاں صاحب بجائے اپنی جگہ پر بیٹھنے کے صوفہ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ آپ کے ہاتھ میں اخبار میں لپٹے ہوئے چند کاغذات تھے مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ کالونی ٹیکسٹائل ملز کے Share Certificates جو میں تمھیں دے گیا تھا وہ لے آؤ تاکہ میں کالونی کے دفتر میں جمع کرا آؤں۔

میں یہ سن کر حیران رہ گیا اور عرض کیا کہ میاں صاحب آپ نے مجھے وہ Shares کب

دیے وہ تو غالباً لائیڈز بنک میں مقفل ہیں۔ فرمانے لگے کہ نہیں کل میں بنک سے لے آیا تھا اور تمھیں دے دیے تھے۔

اب کیا تھا میاں صاحب نے پورے اصرار کے ساتھ کاغذات کا مطالبہ شروع کر دیا۔ بیگم صاحبہ کو فون کیا کہ منیر نے کالونی کے Shares گم کر دیے ہیں جو کہ کل میں نے بنک سے لا کر اسے دیے تھے۔ مجھے حکم ملا کہ فوراً اپنے تمام کاغذات کھنگال کر Shares تلاش کر لاؤں۔ میں گھبرا گیا اور اسی گھبراہٹ میں تلاش شروع کر دی۔ اس افراتفری میں تقریباً ایک گھنٹہ گذر گیا۔ اتنے میں ڈرائیور اندر آیا اور اس نے کہا کہ میاں صاحب جلدی چلیے، کالونی کے دفتر میں Shares جمع کرانے جانا ہے۔

میاں صاحب نے اس سے بھی میری شکایت کی کہ میں نے وہی Shares گم کر دیے ہیں جو کل مجھے انھوں نے رکھنے کے لیے دیے تھے۔ ڈرائیور حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

آخر اس نے کہا کہ میاں صاحب اسی اخبار میں تو Shares لپٹے ہوئے ہیں جو کہ آپ گھر سے ہی لے کر آئے ہیں تب جا کر بات ختم ہوئی۔ اور خود بھی میاں صاحب ہنسنے لگے۔

اسی قسم کا ایک اور دلچسپ واقعہ سنیے۔ ایک دن میاں صاحب دفتری کام میں مشغول تھے اور میں ڈاک دکھانے کے بعد اپنے کمرے میں واپس آ کر ڈاک تقسیم کر رہا تھا کہ میاں صاحب نے مجھے آواز دی کہ میرا قلم میرا قلم بھی ساتھ لے گئے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں جناب۔ لیکن پھر ذرا سخت لہجے میں بولے کہ تمھارے سوا اس کمرے میں کون آیا ہے قلم تم ہی لے گئے ہو۔

میں فوراً ہی میاں صاحب کے کمرے میں گیا اور قلم کی تلاش شروع کر دی۔ چپراسی اور دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ اتفاق سے ایک محترمہ بھی میاں صاحب کو ملنے آئی تھیں اور ان کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ وہ بھی حیران تھیں کہ آخر یہ قصہ کیا ہے۔ کافی تگ و دو کے بعد میں نے عرض کیا کہ میاں صاحب ایک بار اپنی جیبوں پھر دیکھ لیجیے۔ لیکن میاں صاحب نے فرمایا کہ

میں کئی بار جیب دیکھ چکا ہوں، اور جو قلم تمھیں میری جیب میں نظر آرہا ہے وہ تو بال پوائنٹ ہے۔ آخر سب کے اصرار پر میاں صاحب نے اپنی جیب دیکھی تو وہ بال پوائنٹ نہیں تھا بلکہ وہی قلم تھا جس کی تلاش پچھلے ایک گھنٹہ سے ہو رہی تھی۔ سب لوگ ہنستے ہوئے کمرے سے باہر آگئے اور میاں صاحب خود بھی مسکرانے لگے۔

آخری ملاقات

دس دسمبر ۱۹۶۵ بروز جمعۃ المبارک کو میاں صاحب ۱۰ بجے تک دفتر تشریف نہ لائے حالانکہ ان کا عام معمول یہ تھا کہ آٹھ بجے ہی دفتر آجایا کرتے تھے۔ میں نے فون کرکے بیگم صاحبہ سے دریافت کیا کہ میاں صاحب تشریف کیوں نہیں لائے۔ جواب ملا کار کی مرمت کروانے چلے گئے ہوں گے۔ کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب میاں صاحب خاموشی سے دفتر میں داخل ہوئے۔ آج اصغر ڈرائیور نے گاڑی کا ہارن نہیں بجایا تھا اس لیے میاں صاحب کی آمد کا کسی کو پتہ نہ چل سکا۔

کوئی پونے گیارہ بجے شیخ سعید صاحب ریڈر اتفاق سے میاں صاحب کے دفتر میں سے گزرے تو انھیں صوفے پر چپ چاپ لیٹے ہوئے پایا۔ شیخ صاحب نے پوچھا،

"آپ کس وقت تشریف لائے؟"

فرمایا،

"تھوڑی دیر ہوئی آیا ہوں۔ کچھ تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ گھر سے دوائی منگوا کر پی لیتا ہوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

شیخ صاحب نے اشرف صاحب (سیکریٹری) کو میاں صاحب کی ناسازی طبیعت کی اطلاع دی تو وہ بھی میاں صاحب کے کمرے میں تشریف لے گئے۔

سب لوگ میاں صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ بیگم صاحبہ کو فون پر اطلاع دی گئی اور گھر سے دوائی بھی منگوا لی گئی۔ سب کے اصرار کے ساتھ میاں صاحب کو گھر جانے کے لیے

کہا لیکن وہ نہ مانے۔

۱۲ بجے تمام اسٹاف کو جناب عالم صاحب کے ہمراہ مانگا جانا تھا کیونکہ وہ سب کو سکول کی نئی تعمیر شدہ عمارت دکھانا چاہتے تھے۔ میاں صاحب نے فرمایا، آپ لوگ چلے جایئے میں ٹھیک ہوں۔

ہم سب مانگا چلے گئے۔

میاں صاحب ایک بجے دفتر سے اٹھے اور کار لے کر کینیرڈ کالج پہنچے۔ وہاں سے اپنی نواسی کو ساتھ لیا اور سیدھے گھر چلے گئے۔

ہم لوگ چار بجے شام مانگا سے واپس لوٹے۔ ساڑھے پانچ بجے میں غیر شعوری طور پر ایک اضطراب سا محسوس کرنے لگا۔ اپنی چھوٹی بچی کو میں نے ساتھ لیا اور میاں صاحب کے ہاں چلا گیا۔

میاں صاحب بستر پر لیٹے تھے اور بیگم صاحبہ پاس بیٹھی تھیں۔ میں نے حال پوچھا تو فرمانے لگے "ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا" لیکن مجھے معلوم ہوا کہ وہ کچھ سردی بھی محسوس کر رہے ہیں۔ میں نے علیحدگی میں بیگم صاحبہ کو مشورہ دیا کہ اب ڈاکٹر کو ضرور بلا لیں۔ لیکن میاں صاحب نہیں مانتے تھے۔ آخر ہم لوگوں نے بہت اصرار کیا تو وہ بھی رضامند ہو گئے۔ بیگم صاحبہ نماز ادا کرنے لگیں اور اس اثنا میں میاں صاحب میری بچی سے باتیں کرنے لگے،

"کہو بیٹی! مانگا پسند آیا!"

"جی ہاں"

میری بچی نے پوچھا "میاں صاحب آپ نے دوائی پی" جواب دیا کہ ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ ڈاکٹر مجھے ۶ ہفتے تک لٹا دے گا۔ بے بی نے کہا، میاں صاحب نہیں۔ ڈاکٹر صاحب دوائی دیں گے اور آپ کو آرام آجائے گا۔

اتنے میں نماز سے فارغ ہو کر فون کرنے تشریف لے گئیں اور میاں صاحب نے مجھے کہا کہ میں ڈاکٹر کو کہوں وہ E . C . G . کا سیٹ بھی لیتے آئیں۔ میں نے بیگم صاحب کو اس امر کی اطلاع دی اور خود میاں صاحب کو دبانے کی پیش کش کی۔ فرمانے لگے بھئی تم جوان آدمی ہو میں تمھارا بوجھ نہ سہار سکوں گا۔

ساڑھے چھ بجے میں وہاں سے چلا آیا۔

گیارہ دسمبر کی صبح کو جب میں نے میاں صاحب کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا تو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی،

انا للہ و انا الیہ راجعون

یہ خبر سن کر میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ بڑی دیر تک میں غم کی لہروں پر تھپیڑے کھاتا رہا اور انسانی زندگی کی بے ثباتی کا بھیانک منظر بالکل قریب سے دیکھتا رہا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو میں نے اراکین ادارہ کو اس اندوہناک حادثہ کی خبر دی۔ اس خبر کو سنتے ہی ادارہ کے سب آدمی میاں صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

میاں صاحب کے سوگ میں تین دن تک کے لیے ادارہ بند کر دیا گیا۔

اسی روز ۴ بجے شام کو میاں صاحب کو ان کے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

آج میاں صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہمارے دلوں میں ان کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی۔

ابلاغ

"خارجی صورت گری" کہہ دینے سے ابلاغ کی توضیح بھی ناممکن ہے: اگر ایک طرف وہ کیفیت جسے خارجی صورت دی گئی ہے کسی معنی میں فن کار کے ذہن کے بطون سے ہنوز وابستہ ہے تو دوسرے ذہن اس کا ادراک نہیں کر سکتے اور اس طرح ابلاغ کا امکان نہیں رہ جاتا۔ دوسری جانب اگر یہ فن کار کے ذہن سے جداگانہ اور فی الواقع "خارجی" ہے تو پھر یکساں باہم مذاق اذہان کے لیے یہ کلیتہً داخلی نہیں بن سکتی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، کروچے کو اپنی اس مخصوص عینیت سے دست بردار ہو جانا چاہیے تاکہ خارجی صورت گری اور ابلاغ کا امکان ثابت ہو سکے۔

(میاں شریف)

ملفوظات

تشبیہات واستعارات

"صورت حال یہ ہے کہ جو نالے لب تک نہ گئے ہوں، وہی سینے کے داغ بنتے ہیں اور انھیں سے جلوہ گاہ حسن میں چراغاں ہوتا ہے۔ چونکہ رکی ہوئی توانائی اضطراری اور بلاواسطہ اظہار کے طریقوں کی عدم موجودگی میں بالواسطہ اظہار کے طریقے نکال لیتی ہے اس لیے اظہار کی تعمیر میں تشبیہات، استعارات اور اشارات کے پھول بکثرت سجائے جاتے ہیں۔ غالب نے اس مصرع میں:

نفس سوختہ رمز چمن آرائی ہے

اسی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ ناتمام خواہشات سے تمنائیں اور آرزوئیں بنتی ہیں اور انھیں سے حسن کی آبیاری ہوتی ہے:

سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

اور جب تمناؤں کا خون ہو جائے تو اس سے حسن میں صدہا رنگینیاں جلوہ نما ہوتی ہیں۔ اسی سلسلے میں اصغر نے یہ کہنے میں کسی قدر انکسار سے کام لیا ہے کہ

داستاں ان کی اداؤں کی رنگیں ہے لیکن
اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا

(میاں شریف)